ڈاکٹر نفیس اقبال

تصوف: بیسویں صدی کے دانشوروں کی نظر میں

تصوف لغت میں اللہ تعالیٰ سے لَو لگانے کا علم ہے۔ اسے علمِ فقیری اور صوفیا کا مذہب بھی قرار دیا گیا۔ بیسویں صدی سے قبل کے صوفیا نے تصوف کا رشتہ دل کی صفائی سے جوڑا اور اسے دل کی نگہبانی کا کام سونپا۔ امام غزالیؒ نے تصوف کو عالمِ روحانی کی طرف کھلنے والا دروازہ کہا۔[۱] تصوف دراصل ادب، اخلاق اور تہذیبِ نفس کا نام ہے۔ تصوف اخلاص، نظم و ضبط اور اخلاقی انقلاب ہے۔ تصوف ازلی دانش کا نام ہے۔ تصوف عمل کا ایک فلسفہ اور طرزِ حیات ہے۔ تصوف نفس کو عبودیت کے سانچے میں ڈھالنے اور اسے احکامِ ربوبیت کی طرف لے جانے کا نام ہے۔ تصوف ہر اچھی عادت کو اپنانا اور بُری عادت کو ترک کرنا ہے۔ امر و نہی پر صبر کرتے ہوئے افعالِ حسنہ پر ثابت قدم رہنا ہی تصوف ہے۔ تصوف اپنے آپ کو پہچاننے اور باطن کے آئینہ کو صاف کر کے اُس میں جلوۂ خدا دیکھنے کی شدید ترین آرزو کا نام ہے۔ عشق اور وجدان کے ذریعے اللہ سے رابطہ استوار کرنا تصوف ہے۔ تصوف دیدارِ ذات کا وسیلہ اور بقول الف۔ د۔ نسیم خدا کے حصول کی عملی شکل ہے۔[۲]

پروفیسر یوسف سلیم چشتی تصوف کے بارے میں کہتے ہیں:

''تصوف اُس اشتیاق کا نام ہے جو ایک صوفی کے دل و دماغ میں خدا سے ملنے کے لیے اس شدت کے ساتھ موجزن ہوتا ہے کہ اس کی پوری عقلی اور جذباتی زندگی پر غالب آ جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صوفی خدا کو اپنا مقصودِ حیات بنا لیتا ہے۔ گفتگو کرتا ہے تو اسی

کی، خیال کرتا ہے تو اُسی کا، یاد کرتا ہے تو اسی کو، کلمہ پڑھتا ہے تو اُسی کا، شفق کی سرخی میں، دریا کی روانی میں، پھولوں کی مہک میں، بلبل کی آواز میں، تاروں کی چمک میں، صحرا کی وسعت میں، باغ کی شادابی میں، غرض کہ تمام مظاہرِ فطرت اور مناظرِ قدرت میں اسے خدا ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔''[۳]

جیلانی کامران تصوف کو خالص مسلمانوں کی شے سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تصوف کے آداب اُنہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ علم تصوف کی تاریخ ہمارے لیے ایک طے شدہ صداقت ہے۔ تصوف باطن کو آزاد کرنے کی اثباتی فکر کی پہلی منزل ہے۔ تصوف نے انسان کی نفسیات میں اُتر کر خواب و رویاء، القا، مکاشفات اور وصل و وحدت کے مختلف ذریعوں سے انسان کے باطن میں روشنی کرنے کا اہتمام کیا۔ تصوف نے اس زمین پر انسان کو قلب و ذہن کے ساتھ آباد کیا اور کائنات کی نشانیوں کے کھلنے اور کھل جانے کے امکانات پیدا کیے۔ اس اعتبار سے تصوف مسلمانوں کی جانب سے انسانیت کو سونپا ہوا ایک منفرد اور بیش قیمت تحفہ ہے۔[۴]

ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک تصوف کا بنیادی موقف ہی یہ ہے کہ پہلے توڑا جائے اور پھر ایک بلند تر سطح پر اسے دوبارہ جوڑ دیا جائے۔ عام زندگی رشتوں سے عبارت ہے۔ انسان ان رشتوں کو ازلی و ابدی قرار دیتا ہے۔ مگر تصوف اس خیال کو Deconstruct کرتا ہے۔ مثلاً وہ ''موجود اور عدم'' کی دوئی کو اُلٹ دیتا ہے۔ عام انسانی رویہ تو اس موجود کو حقیقی اور اصلی سمجھتا ہے جس کا ادراک اسے اپنی پانچوں حسیات کے ذریعے ہوتا ہے اور اس کے باہر جو کچھ ہے اسے ''عدم'' قرار دیتا ہے۔ تصوف اس تصور کو توڑتا ہے اور کہتا ہے کہ حسیات کی گرفت میں آئی ہوئی کائنات جو کثرت کی مظہر، وقت کے تسلسل کی زد پر اور ایک مسلسل تغیر کی حامل ہے، محض فریبِ نظر یا سراب ہے۔ اصل کائنات تو رنگوں، خوشبوؤں اور آوازوں کی اس دُنیا سے ماورا ایک بے کنار ''اکائی'' ہے جو تغیر، کثرت اور تسلسل سے ناآشنا ہے۔ یوں تصوف ''موجود'' کے بارے میں انسان کے مروّج رویے کو Deconstruct کرتا ہے۔ وہ ہست کو منہدم نہیں کرتا بلکہ ہست کے اس رُخ سے جو Deconstruction کا روپ ہے، انسان کی نظروں کو منقطع کر

کے انہیں اس رُخ پر مرکوز کر دیتا ہے جو Being کا روپ ہے اور یوں Being کو Becoming کے روبرو لا کر کائنات کا ایک نیا بُعد سامنے لے آتا ہے۔[۵]

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب ''شام کی منڈیر سے'' میں اندر کی پراسرار کائنات کا ذکر کیا ہے۔ حقیقتِ عظمیٰ سے اپنا رشتہ جاننے کی خواہش اور روحانی تجربہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ اپنے والد کے حوالے سے اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ''جز کا یہ کام نہیں کہ وہ کُل میں جذب ہونے کی کوشش کرے۔ قطرے کو کیا پڑی کہ وہ سمندر کی تلاش کرے۔ قطرے کو تو صرف یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ خود سمندر ہے۔ قطرہ اور سمندر دونوں پانی ہیں۔ مقدار اور حجم کا فرق ہے۔ صوفی کا کام فقط یہ ہے کہ وہ تمہاری آنکھوں کا رُخ تبدیل کر دے۔ ایسا کرنے کے لیے آنکھوں کے سامنے آئینہ لانے کی ضرورت ہے۔ تب آنکھیں خود کو دیکھنے لگیں گی۔ روحانی اعتبار ہی سے نہیں مادی اعتبار سے بھی پوری زندگی بلکہ پورا موجود ایک ہے۔ اس میں دوئی کا ہونا محض فریبِ نظر ہے۔''[۵-۱]

ڈاکٹر وزیر آغا ترک کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''ترک کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس کلبلاتی ہوئی نام روپ کی حامل کائنات میں رہتے ہوئے تم نام روپ سے اُوپر اُٹھ جاؤ اور لحظہ بھر کے لیے خود کو اتنا پھیلاؤ کہ ہر شے تمہارے وجود کا حصہ بن جائے بس یہی اصل معرفت ہے۔''[۵-۲]

ڈاکٹر وزیر آغا روحانی تجربے کے متعلق لکھتے ہیں کہ اگر انسان روحانی تجربے کو برداشت کرنے کے قابل نہ ہو تو وہ اس کی تاب نہ لا کر ٹوٹ پھوٹ سکتا ہے۔ کوہِ طور کا واقعہ اس کی ایک مثال ہے کہ تجلیٔ ذات کی تاب نہ لا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے۔ دوسری طرف جب حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج کے موقع پر ذاتِ باری کے روبرو آئے تو اُنھوں نے اپنے ہوش وحواس، اپنی ذات، اپنے وجود کو برقرار رکھا کیونکہ وہ روحانی طور پر اس ''عظیم تجربے'' کے لیے تیار تھے۔''[۵-۳]

ڈاکٹر تحسین فاروقی کی رائے میں تصوف کا ظاہری حلیے سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس کا

تعلق شعور و احساس سے ہے۔ فرماتے ہیں:

''ذاتِ احد کی یکتائی کا کامل شعور و احساس ہی تصوف کا دوسرا نام ہے۔ یہ نام ہے جملہ اعتبارات کا، ذاتِ احدیت میں گم ہو جانے کا۔ یہ پشمینہ پوشی، موتراشی اور کلاہ آرائی کا نام نہیں۔''[۶]

ڈاکٹر محمد شریف سیالوی کے نزدیک تصوف دینِ اسلام کی ایک صحیح اور مکمل تعبیر ہے۔ وہ تصوف کو روحِ دین کہتے ہیں اور باعمل عالم کو صوفی جس کا ہر فعل اخلاص پر مبنی ہوتا ہے۔[۷]

پروفیسر ڈاکٹر خالق داد ملک نے تصوف کو اُمتِ مسلمہ کی طاقتور غذا (Tonic) کہا ہے اور تصوف کی بنیاد غور و فکر اور Commitment کو بتایا ہے۔ وہ تصوف کا بنیادی اصول یہ بتاتے ہیں کہ مخلوق کی طرف سے نظر چرائی جائے اور صرف اللہ کریم کی طرف ہر لحظہ توجہ مرکوز رکھی جائے۔[۸]

ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی لکھتے ہیں کہ صوفیؒ کا دعویٰ بھی ہے اور یقین بھی کہ تصوف داخل کی اصلاح، باطن کی تہذیب اور خارج و ظاہر کی تربیت کا کفیل ادارہ ہے۔ اس سے وہ قوتیں بیدار ہوتی ہیں جو مادی یلغار اور نفسانی خواہشات کے دباؤ کی وجہ سے مضمحل ہو جاتی ہیں۔ یہ قوتیں داخل کو قوی اور ظاہر کو آداب آشنا بناتی ہیں۔ تصوف کے ضوابط، اندازِ اخذ و ترک اور طریقِ اصلاح کے ذریعے صفائے قلب کی روشنی اعضاء و جوارح کے اعمال میں منعکس ہوتی ہے، جس سے باطن اور ظاہر کی یک رنگی کی نمود ہوتی ہے اور انسان ایک یکسانی کا مظہر قرار پاتا ہے۔ اس سے ملّی وحدت کو بھی فروغ ملتا ہے اور اصلاحِ بشر کی تحریکوں میں قربت کا احساس بھی اُبھرتا ہے۔[۹]

تصوف ''تلاشِ احسن'' اور ''جستجوئے احسان'' کی وہ ہمہ گیر تحریک ہے جس کا مقصود عبادات میں حسن کی تلاش ہے۔ یہ ہرگز ترکِ عبادت نہیں، یہ تو ظاہری اعمال کے حُسن کے ساتھ مقصدِ اعمال تک رسائی کا نام ہے۔ اس میں اسلامی تعلیمات سے بغاوت نہیں بلکہ ان کی پاسداری کا عزم موجود ہے۔[۱۰]

پروفیسر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ توحید اور انسان دوستی کے مطالب تصوف کو ہر انسان کے لیے اہم اور ہر معاشرے کے لیے مفید بناتے ہیں۔ صوفیا کے توحیدِ خالص، حسنِ خلق اور انسان دوستی کے تصورات میں انسان کی آخرت اور دنیا دونوں کی بھلائی ہے۔ توحیدِ خالص کو اختیار کرنے سے انسان مومنِ صادق بن جاتا ہے یوں اس کی آخرت سنور جاتی ہے، انسان دوستی کا رویہ اپنانے سے وہ معاشرے کا اچھا، معتبر اور مفید فرد بن جاتا ہے، یوں اس کی دنیا سنور جاتی ہے۔ ایک درویش کا قول ہے کہ اگر دوزخ سے رہائی چاہتے ہو تو خدمت خلق کرو اور اگر جنت حاصل کرنا چاہتے ہو تو عبادتِ حق کرو۔ یہ حقائق تصوف کی عالمگیر اہمیت اور اس کی ضرورت کو آنے والی صدیوں میں بھی ثابت و مسلم کرتے ہیں۔[۱۱]

جدید دور کے معاشرتی تقاضوں اور ہنگاموں میں گھرا ہوا انسان عام طور پر خود کو، خدا کو اور انسانیت کو بھلا چکا ہے، لہٰذا سکونِ قلب اور طمانیتِ روح سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ تصوف اس انسان کے کام آ سکتا ہے۔ اس دنیا کے ہنگاموں میں مصروف انسان کو بھی سکون و طمانیت قلب کی دولت سے مالا مال کر سکتا ہے۔[۱۲]

تصوف درحقیقت انسان کا خود کو خدا کے رنگ میں رنگنے کا نام ہے، خدا کے رنگ میں رنگے جانے سے انسان کی زندگی نور میں ڈھل جاتی ہے۔ اس کی گفتار حق و صداقت کا معیار، اس کا کردار ہدایت و رحمت کا سرچشمہ اور اس کی شخصیت اہل جہان کے لیے روشنی کا مینار بن جاتی ہے اور اس کی دعا ہوتی ہے اے اللہ ایسی دانائی دے کہ ہم راہِ حق کو جان جائیں اور ایسی بینائی دے کہ راہِ حق سے گمراہ نہ ہوں، ایسا دل دے کہ جس سے باطل کے سامنے ڈٹ جائیں اور حق کے لیے جان تک قربان کر دیں اور ایسی جان دے کہ جس سے اہل جہاں کے کام سنواریں۔[۱۳]

سید احمد سعید ہمدانی (مذہبی ریسرچ سکالر) نے تصوف کو ''قلبِ اسلام'' کہا ہے اور لکھتے ہیں:

''تصوف دراصل علوم اسلامیہ ہی کا ایک شعبہ ہے جس میں بنیادی طور پر اخلاقی اور

روحانی تعلیم وتربیت کو اہمیت حاصل ہے۔''[۱۴]

اگر حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی نے علم تصوف کو چشمۂ شریعت سے نکلی ہوئی نہر اور تصوف کو احکامِ شریعت پر بندے کے عمل کا خلاصہ کہا ہے تو ڈاکٹر طاہر رضا بخاری نے تصوف کو منشائے شریعت کی تکمیل کہا ہے۔ لکھتے ہیں:

''شریعت اور تصوف کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔

''اتباعِ رسولؐ جب تک ظواہر تک محدود ہے تو اس کا نام دین وشریعت ہے اور جب قلب و باطن بھی نورانیتِ رسولؐ سے منور ہوجائے تو یہ تصوف وطریقت ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ کوئی شخص اگر کتبِ حدیث وفقہ میں درج قواعد کے مطابق نماز پڑھ لے تو شریعت کی رُو سے اس کی نماز مکمل ہوگئی۔ مگر تصوف اس پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ وہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ نماز میں جس طرح چہرہ کعبہ کی طرف متوجہ رہا ہے اسی طرح دل بھی ربِ کعبہ کی جانب متوجہ رہے، جس طرح جسم حالتِ نماز میں ظاہری نجاستوں سے پاک رہا اسی طرح روح بھی باطنی آلائشوں سے پاک رہے، جتنا لباس کا پاکیزہ ہونا ضروری ہے اتنا ہی دل کا بھی تمام خیالاتِ دنیا سے پاک وصاف ہونا لازم ہے۔''[۱۵]

ڈاکٹر طاہر رضا بخاری تصوف کے تین مقاصد بتاتے ہیں:

۱۔ تزکیۂ نفس

۲۔ تصفیۂ قلب

۳۔ معرفتِ ربانی

آگے لکھتے ہیں کہ شریعت میں ان تینوں امور کی جو اہمیت وافادیت ہے اس سے ہر ذی شعور مسلمان آگاہ ہے۔ تزکیۂ نفس کے بغیر کتاب وحکمت کی تعلیم موثر نہیں ہوسکتی اور تزکیۂ نفس کا حصول راہِ سلوک پر چلے بغیر ناممکن حد تک مشکل ہے۔ صوفی نہ صرف گناہوں کو ترک کرتا ہے بلکہ اس کی جڑوں تک کو تلاش کرکے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال باہر پھینکتا ہے۔ یہ کام آسان نہیں، ہوس چھپ چھپ کر سینوں میں گھر بنانا چاہتی ہے، خواہشات بسا اوقات رذائل کو

فضائل کی شکل میں پیش کرتی ہیں، لیکن ایک صوفی ایمان و اخلاص کے سہارے نفس و شیطان کے جال سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس راہ میں بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے اور سخت ریاضت و جانفشانی سے کام لینا ہوتا ہے۔ اللہ کی حضوری و معیت کا تصور اس کے لیے ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔ یہی شریعت کا مقصود ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی انسان کا مطمح نظر آخرت ہو، وہ دنیا میں بھرپور زندگی گزارتے ہوئے اپنے دامن کو دنیاوی آلائشوں سے بچا کر راہِ آخرت کا راہی ہو۔ یہی تصوف کا مقصود و مطلوب ہے۔[۱۶]

عصرِ حاضر میں تصوف کی تعبیر وتفسیر کے سلسلے میں پروفیسر احمد رفیق اختر کا نام بہت مستند و معتبر گردانا جاتا ہے۔ بقول افتخار عارف ''تصوف کی روایت کو توہمات و کرامات کے منطقوں سے نکال کر دلیل و دانش سے جوڑ دینا پروفیسر احمد رفیق اختر کا ایک ایسا کارنامہ ہے، جو ان کے لیے ہی نہیں، ان کے ہم نشینوں کے لیے بھی سبب طمانیت و امتیاز ٹھہرتا ہے۔''[۱۷]

پروفیسر احمد رفیق اختر تصوف کو ''مذہب میں ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ سند'' کہتے ہیں۔[۱۸] وہ تصوف کی بڑی سادہ تعریف یہ کرتے ہیں کہ ''جس شخص نے مناسب عمر میں یہ فیصلہ کرلیا کہ میں فلسفہ ترجیحات پر غور کروں گا اور میری زندگی کی اولین ترجیح میرا رب ہے تو وہ صوفی ہے۔''[۱۹]

تصوف اور دیگر علوم میں فرق بتاتے ہوئے پروفیسر احمد رفیق اختر لکھتے ہیں کہ تصوف میں اور دیگر علوم میں ایک بنیادی فرق ہے کہ یہ علوم آپ سے کردار کا تقاضا نہیں کرتے۔ علوم آپ سے یہ نہیں کہیں گے کہ جب تک آپ نیک اور پرہیز گار نہیں ہوں گے، جب تک پانچ وقت نماز نہیں پڑھیں گے، جب تک آپ روزہ نہیں رکھیں گے، اُس وقت تک ہم آپ کو ایم بی بی ایس کی ڈگری نہیں دے سکتے۔ آپ پی ایچ ڈی کر ہی نہیں سکتے۔ دنیا کی کوئی یونیورسٹی یہ معیار نہیں رکھتی۔ کوئی کردار سازی کو علم کا حصہ نہیں بناتی اور دوسری بات آپ کے ذاتی جذبات کا اثر آپ کے تجربات پر نہیں ہوتا۔ آپ چاہے آنکھوں سے آنسو گرا رہے ہوں، اداس ہوں مگر آپ کے اجزاء وہی نتیجہ دکھائیں گے جو انہوں نے دکھانا ہوتا ہے مگر تصوف میں

ایک ذرا سی لغزشِ خیال آپ کے نتیجے کو بدل دے گی۔ تصوف وہ علم ہے جس میں ذرا سا جلی اور خفی تکبر آپ کے نتائج بدل دیتا ہے۔ ایک جھوٹ آپ کے نتائج مسخ کر دیتا ہے۔ قلبِ ویران کی ایک کیفیت زمین و آسمان کے نقشے بدل دیتی ہے۔ یہ کیسی سائنس ہے کہ جس میں تحقیق و جستجو کی بے انتہا غایتوں کے باوجود آپ کو کچھ اور بھی ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔ اس سائنس میں انسان کے متغیر نفس کا وجود ناقابلِ برداشت ہے۔ تصوف جذبات کی سائنس ہے۔ نفسیات ایک بدتر نفس کو بہتر نفس میں ڈھال دیتی ہے لیکن وہ بندے کو خدا تک نہیں پہنچا سکتی۔ جہاں نفسیات کی آخری حدود شروع ہوتی ہیں وہاں سے تصوف کا ابتدائی قدم اٹھتا ہے۔[۲۰]

پروفیسر صاحب کے مطابق تصوف یقیناً ایمان کی ایک جہت ہے اور ایک سادہ ترین انسان بھی صوفی ہو سکتا ہے، خدا کا شعور رکھ سکتا ہے۔ پروفیسر احمد رفیق اختر تصوف میں اخلاص کو اہم سمجھتے ہیں۔ خلوصِ قلب کے سلسلے میں مثنوی میں مولانا رومؒ نے ایک گڈریے کا واقعہ بیان کیا ہے:

''حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک گڈریے نے اللہ سے مناجات کرتے ہوئے کہا کہ اے اللہ! تو کہاں ہے؟ تو اگر مل جائے تو میں تیرا نوکر بن جاؤں۔ تیرے جوتے گانٹھوں، تیرے بالوں میں کنگھی کروں، تیرے کپڑے دھوؤں، تیری جوئیں ماروں، تجھے اپنی بکریوں کا دودھ پلاؤں... موسیٰ علیہ السلام یہ سن کر سخت برہم ہوئے، اس کو سخت سست الفاظ سے یاد کیا۔ اللہ تعالیٰ کی وحی آئی کہ یہ میرا مقبول بندہ ہے، اسے کچھ نہ کہو۔''

تصوف میں عبادت کا فلسفہ ہی نرالا ہے۔ تصوف میں عبادات کی روح کا خیال رکھا جاتا ہے۔ عابد کا خلوصِ قلب زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

پروفیسر صاحب کے نزدیک تصوف کانٹ چھانٹ کا نام ہے اور جس نے نفس کے ساتھ ہمدردی کی، وہ تصوف کے علم کا ایک ذرہ بھی نہیں حاصل کر سکتا۔[۲۱] اور جس کا پہلا قدم اللہ کی راہ میں اٹھتا ہے، خدا اسے پہلے قدم سے پہلے آن لیتا ہے۔[۲۲] تصوف میں خدا کی حمایت میں نفس کے خلاف ارتکاز ہوتا ہے۔ صوفی خدا کے حق میں نفس کے خلاف جدوجہد کرتا

ہے اور باقی تمام علوم کے ارتکاز میں لوگ اپنے حق میں نفس کے ارتکاز میں جاتے ہیں۔[۲۳] سارے علوم کے دھارے خدا کی ذات سے نکلتے ہیں جو اُس کا ہوگیا وہ گویا علم کے سمندر میں ڈوب گیا۔[۲۴]

پروفیسر احمد رفیق اختر کے نزدیک مشاہداتِ ربانی کی طرف پیشرفت کرنا تصوف ہے۔[۲۵] اُن کے نزدیک تمام انسان صوفی ہوسکتے ہیں۔تصوف کوئی غیر معمولی ہونا نہیں بلکہ تصوف نارمل ہونے کا نام ہے۔تصوف اللہ کے توسط سے اپنی بے محابا حیوانی جبلتوں کو اعتدال میں لانے اور خدا کے احکامات کے تحت حدود اللہ سے تجاوز نہ کرنے کا نام ہے۔تصوف باطنی اور ظاہرہ دونوں خطاؤں سے ذہناً اور بدناً بچنے کا نام ہے۔اس لیے ''جب مجھ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ طریقت کیا ہے اور شریعت کیا ہے، تو میں ان سے کہتا ہوں کہ طریقت شریعت کی نیت ہے۔''[۲۶] صوفی کے نفس میں تغیر نہیں آنا چاہیے۔وہ واحد ایسا شخص ہے جو خارجی بحران سے لڑنے کے ساتھ ساتھ اپنے وجود کی عریانیت اور احساس کمتری کا بھی مطالعہ کرتا ہے۔ وہ محرومیوں کے سیلاب سے بھی گزرتا ہے مگر اپنے ہی سیلف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی نفی اور اس کا بطلان کرتا ہے۔ وہ خداوند کریم اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں بڑھتا ہوا، اعمالِ صالح کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر ایک فکرِ مسلسل کے ساتھ اپنی ہر اندرونی کمزوری کا سامنا کرتے ہوئے ہر روز مرتا ہے۔اگر وہ ہر روز نہ مرتا تو وہ بڑا مجاہد نہیں ہوسکتا تھا۔صوفی کو پتہ ہے کہ مَیں نے ہر حال میں، ہر رنگ میں اپنے آپ کو قتل کرنا ہے۔ ہمارے صوفی کی تعریف یہی ہے کہ وہ جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کو بڑھتا ہے۔ دُنیاوی جدوجہد میں توازن تخلیق کرنے کے بعد ایک باطنی جدوجہد میں مصروف ہو جاتا ہے۔قرآن کی اس آیت پر عمل کرتا ہے کہ خارجی گناہوں سے بھی بچو اور باطنی گناہوں سے بھی بچو۔[۲۷]

تصوف اپنی ذات کے خلاف کرنے کا نام ہے۔اس میں اپنے نفس کے خلاف جانا پڑتا ہے۔ایک خصوصی تہذیبِ نفس سے آگہی حاصل کرنا پڑتی ہے۔[۲۸]

تصوف خدا کو شاید بصارت سے نہیں دیکھتا، مگر اس کی بصیرت میں عام آثار موجود

ہوتے ہیں۔ اسی لیے حدیثِ رسولؐ ہے کہ فراستِ مومن سے ڈرو۔ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

قدیم کو حادث سے علیحدہ کرنا توحید ہے۔ اللہ کے سوا کوئی قدیم نہیں اور پوری کائنات[۲۹] حادث ہے۔ ہر شے اور ہر وجود حادث ہے۔ اگر کوئی قدیم ہے تو وہ اللہ ہے۔ تصوف اس قدیم کو حادث سے الگ کرنے کا نام ہے۔[۳۰] تصوف کسی انسان کی Arrangement of priorities کو کہتے ہیں۔ زندگی کی ترجیحات کو منقسم کرنے کا نام تصوف ہے۔[۳۱] علمِ تصوف کی ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ تمام صوفیا صاحبِ علم ہوتے ہیں۔ تمام علماء عارف نہیں ہوتے، مگر تمام صوفی صاحبِ علم ہوتے ہیں۔ خدا کو جاننے کی ایک بنیادی شرط علم ہے۔[۳۲]

اگر اس کائنات میں آسان ترین تحصیل ممکن ہے تو وہ خدا کی ہے۔ صوفی کا پہلا اور آخری مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ وہ عقل کی نعمت بروئے کار لا کر اپنے خدا کو پہچانے۔ Personal relationship اللہ اور بندے کے درمیان قائم ہوتا ہے۔[۳۳] Sciences اور تصوف میں ایک بہت بنیادی فرق ہے۔ Sciences جس چیز سے deal کرتی ہیں، صوفی اس چیز سے deal نہیں کرتا۔ صوفی حقائق کی تلاش میں ہوتا ہے اور سائنسدان Relationship کی تلاش میں ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑا فرق ہے۔ مشہور فلاسفر رسل (Russel) کہتا ہے کہ ہم صرف اشیاء کے تعلق کو جانتے ہیں۔ ہم اشیاء کی فطرت نہیں جانتے۔ اس کے برعکس صوفی فطرت کو جاننے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔[۳۴]

صوفیا عام انسان سے زیادہ محنت کرتے ہیں کیونکہ تصوف عمومیت سے خصوصیت کی طرف لے جاتا ہے[۳۵] اور خصوصیت یہ ہے کہ صوفی کے نزدیک اللہ کی یاد سے بڑی بات کوئی نہیں۔ اللہ نے انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا نفس تخلیق کیا ہے۔ اللہ کو راضی کرنے کے لیے اپنے ہی نفس کے گلے پر چھری پھیرنی ہوتی ہے۔ اس لیے کائنات میں سب سے بڑا مشکل کام خدا کی آرزو کرنا ہے۔ جب تک نفس کو عزیز چیزوں کی قربانی نہ دی جائے، کامیابی ملنا

ممکن نہیں۔ خدا کسی صورت میں ثانوی حیثیت قبول نہیں کرتا۔ پروفیسر احمد رفیق اختر کہتے ہیں کہ لوگ تصوف کو مشکل سمجھتے ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ تصوف کے بغیر زندگی کا اور کوئی قرینہ ہی نہیں ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ شناخت پر ہمارا حق ہے[۳۶] خدا کی شناخت اور آگاہی کے لیے اپنے آپ کو یعنی Self کو پہچاننا ہوگا۔ حضورؐ کا ارشادِ گرامی ہے کہ جس کو اللہ اپنا علم دینا چاہتا ہے، اس کی آنکھ اس کے اوپر کھول دیتا ہے۔ درونِ کائنات سمجھنے کے لیے Inner computers کا سمجھا جانا بہت ضروری ہے۔ جسمانی اور Physical اذیت میں خدا نہیں ملتا بلکہ عرفان اعتدال میں ہے۔

مولوی اور صوفی میں سب سے بڑا Clash یہ ہے کہ صوفی برداشت کرتا ہے۔ اللہ کا ولی لوگوں کی خطاؤں کو برداشت کرتا ہے، سمیٹتا ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ صوفی جانتا ہے کہ اللہ کی رحمت کا منصب انسانوں کے تمام گناہوں سے بڑا ہے۔ جبکہ مولوی سختی سے خوف کی تمام حجتیں مہیا کرتا ہے اور مسلمان کو خوف کا شکار بنا دیتا ہے۔[۳۷]

اس شخص کو صوفی نہیں مانا جا سکتا ہے جس نے تلاشِ علم اور تکمیلِ علم نہ کی ہو اور جو شناخت وجود اور شناخت غیب نہ رکھتا ہو۔[۳۸]

تصوف وہ تحریک ہے جس میں اچھی طرح خدا کو جاننے کے بعد آپ اس کے قرب اور ہمسائیگی کے لیے پہلا قدم اُٹھاتے ہیں اور پہلا قدم دلیل ہے یعنی ذہن کا پوری طرح صاف ہونا۔ قرآن اسے علم الیقین کہتا ہے۔ اللہ کو اوّل ترجیح مان کر اس کے رستے میں آنے والی مشکلات کے ساتھ رہنا۔ سب سے بڑی مشکل انسان کی انا، خواہشاتِ نفس، تردات اور احساسات ہیں۔ تجسّس اور افسانوی خیالات رستے میں حائل ہوتے ہیں۔ ان رستوں پر آپ اللہ کی نشانیاں دیکھتے ہیں۔ اسباب کو منقطع کر کے پروردگار اکیلے ہی آپ کو صرف اپنے وجود کی دلیل مستحکم کرتا جاتا ہے۔ اس کو ہم عین الیقین کہتے ہیں۔ مشاہدے سے بیزار ہونے پر حق الیقین کا مرحلہ آتا ہے۔ اس سطح پر آ کر خدا وصال سے محسوس نہیں ہوتا، فراق سے محسوس ہوتا ہے۔ جب آپ کے ساتھ ہوگا، آپ نارمل ہوں گے۔ جب آپ کے ساتھ نہیں ہوتا، آپ بے

چینی محسوس کریں گے۔[۳۹]

ملکہ صبا نے کہا کہ بادشاہ جس بستی میں داخل ہوتے ہیں، اسے اُجاڑ اور ویران کرتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا بالکل اسی طرح اللہ جس جسم میں داخل ہوتا ہے، اس کو پہلے تباہ و برباد کرتا ہے اور دل میں خواہشات اور آرزوؤں کے جو بڑے بڑے امراء بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے سر نیچے کر دیتا ہے۔ جب وہ اس بستی کو اچھی طرح اُجاڑ لیتا ہے تو خود آپ آ کے بیٹھ جاتا ہے۔ پھر یہ بستی از سرِ نو آباد ہوتی ہے۔ پہلے اس تعمیر کو ویران کرتے ہیں، پھر اس تعمیر کو دوبارہ استوار کرتے ہیں۔ یہی کارِ تصوف ہے۔ یہی اللہ کا طریق ہے، لیکن اس میں کوئی غیر معمولی واقعہ وقوع پذیر نہیں ہوتا۔[۴۰]

جو شخص حواسِ خمسہ سے ذرا آگے گذر گیا وہ اللہ کو پالیتا ہے۔ حواسِ خمسہ جعلی ہیں۔ یہ پابندی کے حواس ہیں۔ یہ صرف وقتی طور پر زمین پر اپنے آپ کو سمیٹنے کے لیے دیے گئے ہیں۔ اس زمین سے اوپر گلیکسیز میں، ٹاپ خلا میں چلے جائیں، یہ سارے حواس ختم ہو جاتے ہیں۔ وزن اور ذائقہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ حواس حجاب ہیں اور اللہ اس حجاب سے آگے بستا ہے۔[۴۱] حواسِ خمسہ سے آگے گزرتے ہوئے ایک ریفائن ادراک کو ہم اللہ کی محبت کہتے ہیں۔ جب تک ہم حواسِ خمسہ کی گرفت میں رہتے ہیں، ہم پر شرع غالب ہوتی ہے اور جب ذرا آگے Intellectual Refinement میں جاتے ہیں تو پھر ہمیں اللہ بڑے واضح طور پر نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔[۴۲] بات جب پانچ حواس سے آگے جاتی ہے تو خدا کا احساس قریب تر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ذہانت، علم اور دانش ہے جس سے انسان اللہ کو قریب تر محسوس کرتا ہے۔ جبلت خدا کی حریف ہے اور عقل و معرفت خدا کی پہچان کا ذریعہ ہے۔[۴۳] انسان کو خدا نے عقل دی ہی شناخت ذات کے لیے ہے۔ دانشورانہ استعداد کی سب سے بڑی خصوصیت ہی خدا کا ماننا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔[۴۴]

تصوف علوم ذات اور اپنی ذات کی سائیکاٹری سے شروع ہوتا ہے۔ جہاں دورِ حاضر کی نفسیات ختم ہوتی ہے، صوفی کا ادراک وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس لیے کہ نفسیات ایک

کمتر سیلف کو بہتر سیلف میں ڈال دیتی ہے۔ ایک مجبور و مقہور اور گھٹی ہوئی ذات کو کارآمد بنا کر سوشل کر دیتی ہے مگر اس کے پاس یہ ٹاسک نہیں ہے کہ وہ سیلف کو سرنڈر کر کے قدم کی خدمت کا تصور دے---صوفیا اپنے زمانے کے مکمل انٹیلکچوئل ہیں اور اپنے زمانے کی انٹیلکچوئل سطح سے گزر کر خدا کو پہنچتے ہیں۔[۴۵]

جس کو خدا کی تلاش ہے، اس کو اسلام کی تلاش ہے، جس کو اسلام کی تلاش ہے، وہ اللہ کے رستے پر محمد رسول اللہؐ کے بغیر کبھی نہیں پہنچ سکتا۔[۴۶]

قدیم صوفیا اور جدید دانشوروں کے تصوف کی اساس ایک ہی ہے۔ وہاں بھی خدمتِ خلق اور انسان دوستی کی اہمیت ہے اور یہاں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے۔ وہاں بھی تصوف اور شریعت میں کوئی دوری نہیں یہاں بھی یہی کیفیت ہے۔ عشقِ رسولؐ کے بغیر خدا تک رسائی پہلے بھی ناممکن تھی اور اب بھی ناممکن ہے۔ نفس کی مخالفت قدیم صوفیا نے بھی کی اور نفس کو تسخیر کرنا اب بھی ضروری سمجھا گیا۔ اعتدال اور اخلاص کو ضروری پہلے بھی گردانا گیا اور اس کی تلقین جدید دانشور بھی کرتے ہیں۔ خدا کی تلاش اور اس کے قرب کی خواہش پہلے بھی موجود تھی اور آج بھی ہے۔ شاید اس لیے کہ ہمارے شعور کی گہرائیوں میں کہیں میثاق کا عہد اور وژن باقی ہے۔ کوئی دور بھی خدا کے تصور سے خالی نہیں رہا۔

حواشی

[۱] امام غزالیؒ، کیمیائے سعادت، مترجم، محمد سعید الرحمٰن علوی، لاہور، مکتبہ رحمانیہ، ۱۹۸۰ء، ص ۱۲۔

[۲] اللہ دتا نسیم، اُردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر، مقالہ پی ایچ ڈی، مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۹۔

[۳] پروفیسر یوسف سلیم چشتی، مقدمہ تاریخ تصوف، لاہور، دارالکتاب، ص ۱، ۳۔

[۴] جیلانی کامران، ہمارا ادبی اور فکری سفر، لاہور، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، طبع اوّل، ۱۹۸۷ء، ص ص ۳۱، ۳۲، ۱۶۶، ۱۶۹۔

[۵] ڈاکٹر وزیر آغا، تنقید اور جدید اُردو تنقید، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پہلی بار دسمبر ۸۹ء، ص ۱۰۶۔

[۵-۱] ڈاکٹر وزیر آغا، شام کی منڈیر سے، لاہور، مکتبہ جدید پریس، دسمبر ۱۹۸۶ء، طبع اوّل، ص ۵۶۔

[۵۔۲] مذکورہ حوالہ، ص ۵۶۔

[۵۔۳] مذکورہ حوالہ، ص ۵۹۔

[۶] ڈاکٹر تحسین فاروقی، مضمون اقبال اور تصوف، چند تاثرات مشمولہ کتاب اقبال اور تصوف، مصنف محمد شریف بقا، لاہور، جنگ پبلشرز، اشاعتِ اوّل، ستمبر، ۱۹۹۱ء، ص ۹۔

[۷] مجلّہ معارفِ اولیاء، لاہور، مرکز معارفِ اولیاء، ایڈیشن: اوّل، جلد ۶، شمارہ ۳، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۷، ۱۸۔

[۸] مذکورہ حوالہ، ص ص ۳۷، ۴۷، ۴۸۔

[۹] مذکورہ حوالہ، ص ص ۶۱، ۶۲۔

[۱۰] مذکورہ حوالہ، ص ۶۲۔

[۱۱] پروفیسر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ابتدائیہ تصوف اور تصوراتِ صوفیہ، لاہور سیٹھی بکس، ۲۰۰۸ء، ص X۔

[۱۲] مذکورہ حوالہ، ص XIII۔

[۱۳] مذکورہ حوالہ، ص ۴۷۷۔

[۱۴] معارفِ اولیاء، جلد ۶، شمارہ ۳، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۳۵۔

[۱۵] مذکورہ حوالہ، ص ۱۰۸۔

[۱۶] مذکورہ حوالہ، ص ۱۱۵۔

[۱۷] افتخار عارف کا خلاصہ بصورتِ فلیپ، پسِ حجاب سے مشمولہ ''حقیقتِ منتظر''، مصنف پروفیسر رفیق اختر، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۲۸۷۔

[۱۸] پروفیسر احمد رفیق اختر، حقیقتِ منتظر، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۔

[۱۹] مذکورہ حوالہ، ص ۹۵۔

[۲۰] مذکورہ حوالہ، ص ۱۰۰-۱۰۱۔

[۲۱] مذکورہ حوالہ، ص ۱۱۱۔

[۲۲] مذکورہ حوالہ، ص ۱۲۷۔

[۲۳] مذکورہ حوالہ، ص ص ۱۳۰-۱۳۱۔

[۲۴] مذکورہ حوالہ، ص ۲۸۶۔

[۲۵] پروفیسر احمد رفیق اختر، اُٹھتے ہیں حجاب آخر، لاہور سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۷۳۔

[۲۶] مذکورہ حوالہ، ص ۶۸۔

[۲۷] مذکورہ حوالہ، ص ص ۱۰۳، ۱۰۴۔

[۲۸] مذکورہ حوالہ، ص ص ۱۰۶، ۱۰۷۔

[۲۹] مذکورہ حوالہ، ص ۱۶۰۔

[۳۰] پروفیسر احمد رفیق اختر اسلام اور عصرِ حاضر، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۷۰۔

[۳۱] مذکورہ حوالہ، ص ۷۱۔

[۳۲] مذکورہ حوالہ، ص ۷۲۔

[۳۳] مذکورہ حوالہ، ص ۷۴۔

[۳۴] مذکورہ حوالہ، ص ص ۸۵-۸۶۔

[۳۵] مذکورہ حوالہ، ص ۹۸۔

[۳۶] مذکورہ حوالہ، ص ۲۰۰۔

[۳۷] مذکورہ حوالہ، ص ۲۱۶۔

[۳۸] مذکورہ حوالہ، ص ۲۲۳۔

[۳۹] پروفیسر احمد رفیق اختر پسِ حجاب، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۹۔

[۴۰] مذکورہ حوالہ، ص ۹، ۱۰۔

[۴۱] مذکورہ حوالہ، ص ۱۹۔

[۴۲] مذکورہ حوالہ، ص ۲۲۔

[۴۳] مذکورہ حوالہ، ص ۳۷۔

[۴۴] مذکورہ حوالہ، ص ۹۵۔

[۴۵] مذکورہ حوالہ، ص ص ۱۴۷-۱۴۸۔

[۴۶] مذکورہ حوالہ، ص ص ۱۶۰، ۱۶۱۔